بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

جسٹس قدیر الدین صاحب کے مقالے پر معروضات کا جو سلسلہ ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں شروع کیا گیا تھا اُسے بعض دوسرے اہم موضوعات کی وجہ سے روکنا پڑا ہے ۔ آئندہ شمارے میں انشاءاللہ اسے پھر جاری کر دیا جائے گا ۔

---

شیرپاؤ کے قتل سے حکومت جس طرح ناجائز سیاسی فوائد حاصل کرنے میں مصروف ہے وہ اپنی جگہ کتنے ناپسندیدہ ہی سہی لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ کسی بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے ۔ قرآن مجید نے ایک شخص کے قتلِ ناحق کو پوری نوعِ انسانی کے قتل سے تعبیر کیا ہے ۔ ہمیں اس قتل سے اُتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا کہ کسی بے گناہ کے قتل سے ہوسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے سینے کے وہ زخم بھی ہرے ہوگئے ہیں جو ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق ، عبدالصمد اچکزئی ، مولانا شمس الحق اور اسی طرح کے بعض دوسرے بے گناہوں کے قتل سے لگے تھے ۔ ہم اس خوفناک رجحان کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس دن سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ جس دن ہمارے مُلکی مسائل افہام و تفہیم کے بجائے " قاطعِ شمشیر " کے ذریعے حل ہونے لگیں ۔ مرحوم شیرپاؤ کے قتل کے سلسلے میں ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ میں چند سوالات ضرور اُبھرتے ہیں جن کے صحیح اور تشفی بخش جوابات کے بغیر دلوں کی خلش دُور نہیں ہوسکتی ۔

---

حکومت کے اپنے ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ کابل ریڈیو کئی دنوں سے شیرپاؤ

کے قتل کی دہائی دے رہا تھا اور اس روح فرسا حادثہ سے پہلے بھی ان پر تین چار بار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم حکومت کی ان اطلاعات کے بارے میں کوئی شک کریں۔ اگر فی الحقیقت شیرپاؤ کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق تھا تو اس قیمتی جان کے تحفظ کے لیے، جو نہ صرف برسراقتدار طبقہ کی منظورِ نظر تھی بلکہ انتظامیہ پر پورا اختیار رکھتی تھی، کیا انتظامات کیے گئے؟ ذہن ان انتظامات کی تفصیل سننے کے لیے بیقرار ہیں۔ وہ کوئی عام کارکن نہ تھے کہ بغیر سرکاری حفاظتی دستوں کے یونیورسٹی کی تقریب میں چپکے سے چلے گئے اور وہاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے انہیں پہلے باقاعدہ دعوت دی گئی ہوگی اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی اس کے انعقاد کا اعلان ہوا ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ظالمانہ حرکت اس تقریب کے منتظمین اور شرکاء میں سے تو کوئی نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ ان کے لیے بھی اسی طرح جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی جس طرح کہ شیرپاؤ کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ بم نہ صرف حاضرین بلکہ منتظمین کے آنے سے بیشتر ہی رکھا گیا تھا۔ سکیورٹی کے ذمہ دار افراد جو ایسے موقعوں پر غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہوں نے آخر اس خاص موقع پر کیوں مجرمانہ تغافل سے کام لیا۔ خصوصاً جب کہ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ جس وزیر باتدبیر کو موت کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اس کا براہ راست تعلق اُن کے محکمے ہی سے ہے۔ اخبارات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بم کے دھماکہ کے فوراً بعد بھی پولیس نے حادثہ کے اس مقام کی طرف رجوع نہ کیا اور طلبہ ہی شیرپاؤ کو شدید زخمی حالت میں اُٹھا کر باہر لائے اور جب انہیں ہسپتال میں لے جانے کا انتظام ہو چکا تو پھر پولیس کو وہاں پہنچنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

---

شیرپاؤ کی موت کے بعد حکومت نے مخالف سیاسی جماعتوں خصوصاً نیپ کے بارے میں جو نا روا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اس سے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ نیپ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا یہ الزام درست ہے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے باقاعدہ سزا دلوانے کا التزام کیوں نہ کیا گیا؟ اور اگر یہ سب کچھ خاموش تماشائی بن کر برداشت کیا جا رہا تھا تو اب کونسی جلدی تھی کہ شیرپاؤ کے قتل کے ساتھ ہی اُسے کچل دینے کی کوششیں شروع ہوئیں؟ اگر حکومت ماضی میں صبر و تحمّل سے کام لیتے ہوئے اس جماعت کو اصلاح کے مواقع فراہم کر رہی تھی تو اب اصلاح کے موقع سے اسے اس قدر عجلت کے ساتھ کیوں محروم

کر دیا گیا؟ جب معاملہ سپریم کورٹ میں پیش کیا جانا ہی تھا تو کیا یہ بہتر اور موزوں نہ تھا کہ عدالتِ عظمےٰ کے فیصلے کے بعد ہی اس جماعت کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی۔ جہاں اس کی "ملک دشمن سرگرمیوں" کو اتنی مدت تک برداشت کیا گیا وہاں پندرہ بیس دن کی تاخیر سے آخر کونسی قیامت ٹوٹ پڑنے کا خدشہ تھا۔

---

دلوں کے حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کے منصب پر فائز بعض اونچی شخصیتوں نے شیر پاؤ کے قتل پر ایسا ردِعمل ظاہر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس قتل سے جس قدر صدمہ پہنچا ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ انہیں اپنے مخالفین کو تہس نہس کرنے کا زرّیں موقع ہاتھ لگا ہے۔ خاں قیوم کے لیے تو اپنے ان جذباتِ مسرت کو چھپانا مشکل ہو رہا ہے۔ انہوں نے ۱۸ رفروری کو پشاور میں گورنر راج کے نفاذ پر جس شادمانی کا اظہار کیا اُس سے اُن کے دل کی کیفیت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ وزیرِ تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کا یہ ارشاد کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ اُن کے اقدام کی توثیق ہی کرے گا نہ صرف ان حضرات کے اندرونی عزائم کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ان لوگوں کو نشۂ اقتدار نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں انہیں اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی اہمیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ اُن کے جی میں جو آتا ہے بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ ترنگ میں آکر جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں اسے اِس ملک کے لوگ ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی سُن رہی ہے اور ان کے ان فرمودات ہی سے بیرون ملک ہمارے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے گی۔ اگر یہ حضرات مسندِ اقتدار پر ہمیشہ کے لیے براجمان رہنے کا عزم رکھتے ہیں تو اِس کے لیے انہیں کوئی قرینہ بھی سیکھنا چاہیئے۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے سیاسی وقار بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہے۔

---

یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن ہے کہ معاشرے میں اس شخص کی قطعاً کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جو کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہ ہو کیونکہ اگر وہ کسی اصول کی پابندی کرنے پر آمادہ نہ ہو گا تو اس کے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ اندازہ نہ ہو سکے گا۔ ایک دیوانے اور ہوشمند انسان کے مابین ظاہری اعمال کے لحاظ

سے سب سے نمایاں فرق یہی ہوتا ہے کہ ہوشمند فرد کی طبیعت میں ٹھہراؤ کے علاوہ ایک طرح کی ہمواری اور استواری بھی پائی جاتی ہے اور انسان اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ خاص حالات میں کونسا ردِّ عمل ظاہر کرے گا۔ اس کے مقابلے میں ہوش وخرد سے عاری فرد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کیا حرکت کر بیٹھے۔

افراد کی طرح قوموں کا اور ملکوں کا وقار بھی اجتماعی ضابطۂ اخلاق یعنی دستور اور آئین سے وابستہ ہوتا ہے۔ دستور ہی کسی قوم کا نصب العین اور پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کے خطوط متعین کرتا ہے۔ اسی دستور کی مدد ہی سے حکومت اور عوام کے مابین حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ پھر اس دستور کی وجہ سے کسی قوم کے اندر اچھی روایات پرورش پاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی قوم ایک طویل مدت تک اپنے آپ کو ایک خاص ضابطے کی پابند بنا کر سرگرمِ عمل رہے تو اس کے دل و دماغ میں ان ضابطوں کی پابندی اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ اس کے افراد قانونی گرفت کے خوف کے بغیر ہی ان کی پابندی کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح حکومت اور عوام دونوں کو اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنی قوتوں کو تعمیری راہ پر لگانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے اندر استحکام پیدا ہوتا ہے اور بیرونِ ملک قوم کا وقار بڑھتا ہے۔ اس بنا پر دنیا کی کوئی مہذب قوم اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ وہ جس زمین پر آباد ہے وہ زمین بے آئین رہے اور اس کے عوام اور سربراہ کسی ضابطے کے پابند نہ ہوں کیونکہ دستور اور آئین سے بے نیازی کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ قوم جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ لہٰذا دستور ہر مہذب اور باوقار قوم کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے پاکستان کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم کو ابھی تک اس بنیادی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ آزادی سے لے کر ۱۹۵۶ء تک یہ ملک بغیر کسی دستور کے ہی زندہ رہا اور اس طرح اس ملک کے حکمرانوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کے کھلے مواقع فراہم ہوتے۔ یہاں کے برسرِ اقتدار طبقے عوام کے حقوق کو پامال کرنے میں کس حد تک جری اور بیباک تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سرپھرے اور مفلوج آمر نے نشۂ اقتدار میں بدمست ہو کر ۱۹۵۳ء میں دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی پوری کابینہ اور اس کے آئینی سربراہ کو برطرف کر دیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں فیڈرل کورٹ کے حکم کے مطابق جب دستور ساز اسمبلی از سرِ نو معرضِ وجود میں آئی تو اس نے ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا دستور تیار کیا جس کو قوم نے چند ترامیم کے ساتھ ملّی آرزوؤں کا کسی حد تک ترجمان سمجھتے ہوئے

قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کے مطابق انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن عین اُس وقت جب قوم انتخابی سرگرمیوں میں مصروف تھی ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کر کے اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ملک پر چار سال تو مارشل لا مسلط رہا بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں ایک دستور جس میں قوم کی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا ملک میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ نافذ ہوا۔ اس دستور کا مقصد صرف یہ تھا کہ سربراہ مملکت کو مارشل لا کی رُو سے جو وسیع اختیارات حاصل تھے انہیں آئینی جواز فراہم کر دیا جائے مگر عوام نے اسے بھی یہ سوچ کر گوارا کر لیا کہ چلیے اس کے نفاذ سے مارشل لا تو ختم ہو جائے گا اور وہ دنیا کے سامنے یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ ان کے ہاں ایک دستوری اور آئینی حکومت قائم ہے۔

اس دستور کے نفاذ کے بعد عوام کے اندر یہ ولولہ بیدار ہوا کہ وہ اپنے چھِنے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لیے جد و جہد کریں اور برسرِ اقتدار طبقے کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دستور کے اندر ایسی ترمیمات کر دے جن سے ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب بڑی مشکل سے اس بات کے لیے تیار ہوئے تھے کہ ۱۹۶۹ء میں پھر ملک مارشل لا کے چنگل میں آ گیا اور اسی انتشار اور افراتفری کے عالم میں ہمیں نصف ملک سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دلفگار المیہ کے پیچھے بیرونی ہاتھ بھی تھے مگر اس حقیقت کو آخر کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں دستوری خلا ہونے کی وجہ سے عوام کے اندر یہ تاثر پوری طرح پھیل چکا تھا کہ اس ملک میں انسان تو صرف چند اصحابِ اقتدار ہی ہیں۔ ان مقتدر ہستیوں کے علاوہ جو لوگ بھی اس سرزمین میں آباد ہیں اُن کے کوئی حقوق نہیں۔ اُن کی زندگی کا مقصد محض آقاؤں کی خدمت اور چاکری ہے۔ اس احساس ہی نے ان کے اندر یاس و قنوطیت اور نفرت کو جنم دیا جن سے بالآخر ملک دو لخت ہو گیا۔

---

اس خوفناک تباہی کے بعد ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اُسے عوام نے اپنے ووٹوں سے منتخب کیا ہے۔ مگر بد قسمتی سے اس حکومت کے سربراہ وہ شخص بنے جن کے آمرانہ عزائم کسی سے ڈھکے چھُپے نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک آئینی سربراہ کی حیثیت سے حلف اُٹھانے کے بجائے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اُٹھانا پسند کیا اور مارشل لا کو ایک خاص مدت تک نافذ رکھنے پر سخت اصرار کرتے رہے۔ زخموں سے چُور اور خستہ حال قوم نے دل پر پتھر رکھ کر اُن کے

اس صریح ناجائز مطالبے کو مان لیا کیونکہ اُسے یہ ڈر تھا کہ اُن پُر آشوب حالات میں اختلاف کی چنگاریاں کہیں پاکستان کے مغربی حصے کو بھی جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ مارشل لا سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھٹو صاحب نے جس طرح کی آمرانہ کارروائیاں روا رکھیں ان سے پوری دنیا واقف ہے۔ جمہوریت کے "یہ دعویدار" اس بات کے لیے برابر کوشاں رہے کہ اس ملک میں عرصہ دراز تک جمہوریت کی تذلیل ہوتی رہے لیکن عوام کے دباؤ کی وجہ سے جب وہ جنگل کے اس قانون کو خیرباد کہہ کر ایک دستور کے تحت حکومت کرنے پر یکسر مجبور ہو گئے تو انہوں نے ایک ایسا دستور تیار کیا جس میں برسراقتدار طبقے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس دستور میں جس قسم کی ناانصافیوں کو تحفظ دیا گیا وہ سب پر عیاں تھیں اور ہر سوچنے سمجھنے والا شخص اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ یہ دستور ایک مسلم قوم کی امنگوں کا ترجمان نہیں ہے لیکن حزبِ اختلاف نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اسے محض اس بنا پر قبول کر لیا کہ کسی طرح اس بدنصیب قوم کو مارشل لا کی لعنت سے تو چھٹکارا حاصل ہو۔ حزب اختلاف کی دستور کے بارے میں جو رائے تھی وہ تو سب کے سامنے ہی ہے لیکن برسراقتدار طبقے نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ چشمِ فلک نے آج تک اس سے زیادہ بہتر، اس سے زیادہ جمہوری اس سے زیادہ اسلامی مزاج کا حامل اور اس سے زیادہ جامع و مانع کوئی دوسرا دستور نہیں دیکھا لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جس طبقے نے اتنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس دستور کو نافذ کیا تھا اُس نے ڈیڑھ سال کی مدت گذرنے سے پہلے ہی بنیادی مسائل تک میں ترمیم کرنا شروع کر دی۔ حکمران طبقہ اکثریت کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا ہے دستور کا حلیہ بگاڑتا چلا جاتا ہے لیکن طاقت کے زعم میں وہ غالباً اس حقیقت کو بھول رہا ہے کہ اُس کی اِس دیدہ دلیری سے ان امور میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے جن میں تھوڑی مدت پیشتر اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتشار کے جس دیو کو قوم نے بڑی مشکل سے پابند سلاسل کیا تھا برسراقتدار طبقہ خود اس کی زنجیریں کھول کر اُسے تباہی مچانے کے لیے آزاد چھوڑ رہا ہے۔

اگر اربابِ حکومت ہی دستور کے تقدس کو پامال کرنے لگیں تو عوام کی نظروں میں اس کا احترام کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ کیا دستور کے معاملے میں ان کی اس غیر سنجیدہ روش سے عوام کے اندر یہ احساس پیدا نہ ہو گا کہ حکمران طبقے کی خواہشات کا نام ہی دستور ہے جو ان کے بدلتے ہوئے مصالح کے ساتھ ساتھ خود بخود تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ احساس بڑھتا گیا تو کیا بقول رُوسو دستور کے متعلق عوام یہ سمجھنے پر مجبور نہ ہوں گے

کہ جس ضابطہ کو یہاں دستور کہا جاتا ہے اس کی حیثیت تو مکڑی کے جالے کی سی ہے جو صرف کمزوروں اور ناتوانوں کو پھانسنے کے لیے بُنا گیا ہے ورنہ جہاں تک اصحابِ اقتدار کا تعلق ہے وہ اسے جس وقت چاہتے ہیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور کوئی اُن سے باز پرس کرنے والا نہیں ہوتا۔ بنیادی اُمور میں حالیہ دستوری ترمیم جن مقاصد کے تحت اور جس جلد بازی اور تیزی سے کی گئی ہیں ان سے عوام کے خدشات میں بہت حد تک اضافہ ہوا ہے اور اربابِ اختیار کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود کہ وہ ملک میں یک جماعتی حکومت نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، اسلام اور جمہوریت کا مستقبل بڑا تاریک پاتے ہیں۔ اگر آپ ان ترامیم پر نگاہ ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں بڑی تیزی کے ساتھ جمہوریت کا گلا گھونٹ کر آمریت کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔

---

آئین میں شہری آزادیوں کے سلسلے میں عوام کو یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ کسی شخص کو ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کرنے کی صورت میں ایک ماہ بعد لازمی طور پر جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب یہ میعاد ایک ماہ سے بڑھا کر تین ماہ کر دی گئی ہے یعنی حکومت ایک شخص کی آزادی بغیر کوئی وجہ بتائے تین ماہ تک بڑی بے تکلفی کے ساتھ سلب کر سکتی ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک ترمیم کے ذریعے حکومت کو اس امر کا بھی اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرے کہ اس کا وجود ملک کی سلامتی، استحکام اور خود مختاری کے لیے خطرہ ہے یا وہ کسی ایسی جماعت کا رکن ہے جو قوم دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو اس کا معاملہ سرے سے جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت جس شخص کو چاہے نہ صرف گرفتار کر سکتی ہے بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق غیر معینہ مدت تک جیل میں بھی ڈال سکتی ہے اور کوئی اس سے اس امر کی باز پرس نہیں کر سکتا کہ آخر اس پر یہ ظلم کس جرم کی پاداش میں کیا جا رہا ہے۔ اسی ضمن میں دستور کے اندر ایک تبدیلی یہ بھی لائی گئی ہے کہ پہلے حکومت اس بات کی پابند تھی کہ وہ جس شخص کو گرفتار کرے اسے ایک ہفتہ تک اس بات کی اطلاع دی جائے کہ حکومت کی نظروں میں وہ کیوں معتوب ہے۔ اب یہ میعاد ایک ہفتہ سے بڑھا کر پندرہ دن کر دی گئی ہے۔ یعنی حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ جس شخص کو چاہے دو ہفتہ تک قید و بند میں ڈال دے اور اس پابندِ سلاسل شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے ساتھ یہ ناروا سلوک اس کے کس فعل کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔

(باقی برصفحہ ۴۲)

(بقیہ اشارات) شہری آزادیوں پر دوسری ضرب کاری، ہنگامی حالات کو دوام عطا کرکے لگائی گئی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند تھی کہ اگر وہ ہنگامی حالات میں توسیع کرانا چاہتی ہے تو اس مسئلہ کو ہر ششماہی کے بعد اسمبلی میں پیش کرکے توسیع حاصل کرے لیکن اب حکومت نے ایک ترمیم کے ذریعہ اس تکلف سے بھی اپنے آپ کو بے نیاز کرلیا ہے۔ وہ اپنے مصالح کے تحت جب تک چاہے ملک میں ہنگامی حالات برقرار رکھ کر لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھ سکتی ہے۔ اصحابِ اقتدار نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ملک کے نمائندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ارکان کی اکثریت ہنگامی حالات کی قرارداد منظور کرلے تو پھر ان کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ کیا موجودہ حالات میں کبھی اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ سینٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں کوئی ایسی قرارداد منظور کی جاسکے گی جو بھٹو صاحب کے منشا کے خلاف ہو۔

---

ملک کو آمریت کی راہ پر ڈالنے والے ان متعدد دستوری تغیرات میں، جنہیں بڑی ہنرمندی کے ساتھ ترمیمات کا نام دیا گیا ہے، پولیٹیکل پارٹی ایکٹ بھی شامل ہے۔ یہ وہ ایکٹ ہے جو محمد ایوب خاں جیسے آمرِ مطلق کے عہد میں نافذ ہوا اور جسے ۱۹۷۳ء کے دستور میں تحفظ دیا گیا۔ اس ایکٹ کی رُو سے اگر حکومت کسی سیاسی جماعت کو ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث پائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کا معاملہ عدالتِ عظمیٰ میں پیش کرے اور اس کے فیصلے کی روشنی ہی میں کوئی قدم اُٹھائے۔ پھر ارکانِ اسمبلی کو بھی یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ انہیں اسمبلی کے اجلاس کے دوران یا چند روز پہلے یا چند روز بعد گرفتار نہیں کیا جاسکتا لیکن جمہوریت کے ان علمبرداروں نے فیلڈ مارشل صاحب کی آمریت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب ایک ترمیم کے ذریعے حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ وہ جس سیاسی پارٹی کو چاہے سپریم کورٹ سے پیشگی اجازت لیے بغیر کالعدم قرار دے دے اور اس کارروائی کے پندرہ روز بعد عدالت عظمیٰ کی طرف رجوع کرے۔ کسی سیاسی جماعت پر اس سے بڑا ستم اور کیا ہوسکتا ہے کہ پہلے حکومت پوری قوت سے اس کا شیرازہ منتشر کردے، اس کے ارکان کو اپنے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنائے، اس کے فنڈز اور اس کی جائیداد ضبط کرلے اور پندرہ دنوں میں انتقام کی آگ بجھا کر پھر عدالتِ عظمیٰ سے اپنی ان منتقمانہ کارروائیوں کی توثیق حاصل کرے۔ انصاف کا یہ کونسا انداز ہے کہ اس "معتوب" جماعت کے سربراہ تو جیلوں میں بند ہوں، فضا میں خوف وہراس کی کیفیت

طاری ہو، حکومت کے ذرائع ابلاغ اس سیاسی جماعت کے قائدین کی کردارکشی میں بڑی بیباکی کے ساتھ مصروف ہوں اور پھر اس امر کی توقع کی جائے کہ اس جماعت کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سپریم کورٹ جیسی عظیم عدالت حکومت کی ان ساری کارروائیوں سے متاثر ہوئے بغیر صحیح فیصلہ کرے گی تو اس نقصان کی تلافی کی آخر کیا صورت ہوگی جو اس جماعت کو حکومت کے سپریم کورٹ تک پہنچنے اور حقائق کی چھان پھٹک کے بعد اس کے فیصلہ صادر کرنے تک پہنچ چکا ہوگا۔

---

ماہرین نفسیات نے انسانی ذہن کا عمیق مطالعہ اور مشاہدہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی انسان کی قلبی کیفیت اور اس کے اصل عزائم کو جاننے کے لیے اس کے نمایاں کارناموں کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے غیر ارادی افعال اور روزمرہ سرگرمیوں پر نگاہ رکھنی چاہیے کیونکہ وہ عظیم کارناموں کے پردے میں اپنی اصلی نیت کو بآسانی چھپا سکتا ہے لیکن غیر اہم کاموں میں حقیقت خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس طرح تناور درخت ہوا کے رخ کا پتہ نہیں دیتے بلکہ تنکوں سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے اسی طرح حکومت کے وسیع تعمیراتی منصوبوں اور بلند بانگ دعووں سے اس امر کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کے ذہن میں ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا کیا نقشہ ہے۔ اس کے جانچنے کے لیے تو ہمیں لامحالہ اس کی ان سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جنہیں وہ بظاہر ملکی استحکام کی کوششوں سے تعبیر کرتی ہے مگر ان کا اصل مقصد اپنے اقتدار کو دوام بخشنا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دستور میں عاجلانہ ترمیمات کے علاوہ صوبہ سرحد میں گورنر راج کے نفاذ پر غور کریں۔ اس صوبے میں کسی مخالف سیاسی جماعت کی حکومت قائم نہ تھی بلکہ برسر اقتدار پارٹی ہی مسند اقتدار پر فائز تھی۔ پھر صوبائی کابینہ میں کوئی ایک وزیر بھی ایسا نہ تھا جس سے اس بات کا خطرہ ہوتا کہ وہ کبھی وزیر اعظم کے کسی حکم کی تعمیل میں کوئی ادنیٰ تامل بھی کر سکے گا۔ سب وزرا ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جناب ذوالفقار علی بھٹو کے نیازمند اور اپنی اس نیازمندی پر فخر کرنے والے تھے۔ آخر کیا وجہ ہوئی کہ ان سب کو بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا گیا اور جمہوریت کے شیدائی نے اس کی بساط خود اپنے ہاتھوں سے لپیٹ کر وہاں گورنر راج کا تخت بچھا دیا اور اس کے یمین و یسار وہ مشیر جمع کیے، جن کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان پر نگاہ انتخاب کچھ دوسرے مصالح کے تحت پڑی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں

کہ بھٹو صاحب کو خود اپنی پارٹی پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا۔ یا وہ ہر فیصلہ کن مرحلے پر اپنی پارٹی سے یہ اندازِ بے نیازی اختیار کر کے اُسے باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی باندی ہے جس سے وہ جب چاہیں حسبِ منشا کام لے لیں اور جب چاہیں یکسر نظر انداز کر دیں۔ وہ ان سے کوئی تقاضا نہیں کر سکتی۔ عوام کے نمائندوں کی موجودگی میں غیر نمائندہ مشیروں کا تقرر اگر پیپلز پارٹی کی بے حُرمتی کے علاوہ ملک میں بڑھتے ہوئے آمرانہ رجحانات کا پتہ نہیں دیتا تو کس چیز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ ملکی استحکام کے نام پر کیا گیا ہے اور حکومت کے حاشیہ بردار اور طالع آزما اس اقدام کی تائید میں بیانات پر بیانات دیتے چلے جا رہے ہیں لیکن جو لوگ اس ملک کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں انہیں ان تنکوں کی جنبش ہی سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کہیں دوسرے صوبوں میں بھی ڈرامہ کھیلنے کی تیاریاں تو نہیں کی جا رہیں۔

ہم بھٹو صاحب کے بارے میں کوئی سوئے ظن نہیں رکھتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انہیں ملکی استحکام بڑا عزیز ہے اور اسی استحکام کی خاطر انہوں نے بلوچستان کی نمائندہ حکومت ختم کر کے وہاں اقلیتی پارٹی کو صوبے کا نظم و نسق سونپ دیا ہے۔ اور اب اس امر کے لیے کوشش کی جا رہی ہے کہ اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے تاکہ ان کی اس دلیرانہ کارروائی پر انگشت نمائی نہ کی جا سکے۔ غالباً وطن کی محبت ہی کی وجہ سے انہوں نے سرحد میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط وزارت کو برطرف کر کے وہاں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کی تھی جسے توڑ کر اب وہاں گورنر راج قائم کر دیا گیا ہے۔

وزیراعظم ملک کے اندر اور باہر جو کچھ بھی کر رہے ہیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہی کر رہے ہیں اور شاید پاکستانی قوم کی بہبود کی خاطر ہی گذشتہ سال انہوں نے کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا اور اس طرح قومی تقاضوں کے پیش نظر بھارتی جارحیت کے اس گھناؤنے جُرم کو فراموش کر کے اس سے تعلقات بحال کرنے میں پیش قدمی کی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس ضمن میں جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ قوم اور ملک کی سربلندی کے لیے ہی کر رہے ہیں لیکن ہم اس مرحلے پر ان کی خدمت میں یہ گذارش ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ نیت خواہ کتنی ہی نیک ہو لیکن اس دنیا میں اگر معروف قواعد و ضوابط سے ہٹ کر کوئی کام کیا جائے تو اس سے انسان کا وقار گرتا ہے۔ مثلاً اگر نیکی کا کوئی علمبردار خلوص نیت کے ساتھ ایک پارسا کو اس بنا پر قتل کر دے کہ وہ پارسائی کے ساتھ شہادت کا بلند مرتبہ بھی حاصل کر لے تو اس کے اس فعل پر

خواہ اس کے پیچھے کتنا ہی مقدس جذبہ کارفرما ہو، لوگ نفرین ہی بھیجیں گے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی سربراہ مملکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ ملکی استحکام اور قومی سربلندی کی خاطر عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرتا ہے تو وہ خلوص نیت کے باوجود اپنے خلاف نفرت کے جذبات کی آبیاری کرتا ہے۔ دنیا میں وہی اخلاص قابل قدر ہے جس سے دوسرے انسانوں پر بلاوجہ کوئی آنچ نہ آئے۔

---

بھارت قوت وطاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر اپنے کمزور ہمسایوں خصوصاً پاکستان پر جو ظلم وزیادتی کر رہا ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت ہی سیاہ باب ہے۔ اگر بھارت کے رہنماؤں کے دل میں انسانیت کا کچھ بھی احترام اور انسانی حقوق کا کوئی پاس ہوتا تو وہ پاکستان کو تباہ کرنے کے بجائے اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے مگر افسوس وہ اوّل روز ہی سے اسے نیست ونابود کرنے کے درپے ہیں۔ صلح وآشتی کے ان دعویداروں نے پہلے جوناگڑھ پر قبضہ کیا، پھر حیدرآباد کی آزادی سلب کی اور کشمیر پر ہر اصول اور ضابطے کو پامال کرتے ہوئے قابض ہو گئے۔ ایک قوم کی اس سے بڑی اخلاقی گراوٹ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حیدرآباد پر تو یہ کہہ کر قبضہ کرے کہ کسی ریاست کا الحاق اس ملک کے باشندوں کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے لیکن اپنے اس اصول اور ضابطے کے بالکل برعکس کشمیر پر اپنا تسلط اس بنیاد پر قائم کرے کہ اس کے مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کی درخواست دی ہے۔ دنیا میں آج اگر حق وانصاف کی فرمانروائی ہوتی تو پوری انسانیت مل کر اس ظلم کے خلاف جدوجہد کرتی لیکن بدقسمتی سے آج کی دنیا میں جبر واستبداد کی حکمرانی ہے اور قوموں کی باہمی آویزش نے انہیں اس حد تک مفاد پرست بنا دیا ہے کہ وہ کسی معاملے کو حق وانصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ مادی مفادات کے مطابق طے کرتی ہیں۔ بھارت چونکہ اس وقت پاکستان کے مقابلے میں بڑی طاقت ہے، اس کے علاوہ پاکستان جس نظریاتی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے اس سے مغربی دنیا کو خطرہ لاحق ہے اس لیے وہ بھارت کے ہر اس اقدام کی تائید وحمایت کرتی ہے جس سے پاکستان کا شیرازہ منتشر ہو۔ دنیا کی اخلاقی بے حسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیر کے معاملے میں اپنے سارے مواعید کو یکسر نظر انداز کر کے اس مظلوم وادی پر پچھلے ستائیس سالوں سے قابض چلا آ رہا ہے اور کوئی اس سے بازپرس نہیں کرتا۔ اقوام متحدہ کی

کمزوریاں اور مجبوریاں اپنی جگہ سہی لیکن ہم یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں کہ اگر مظلوم قوموں کو انصاف دلوانے والا یہ ادارہ نیک نیتی سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنا چاہے تو حل نہ کرا سکے۔ بھارت میں ابھی اتنا دم خم پیدا نہیں ہوا کہ وہ بڑی طاقتوں کے مطالبہ کو مسترد کر دے لیکن افسوس کہ بڑی قومیں ہی اس ظلم میں بھارت کی پشت پناہ ہیں اور وہ ان کی تائید سے پاکستان کے ایک حصّہ پر بالکل ناجائز طور پر ربع صدی سے تسلّط قائم کیے ہوئے ہے۔

---

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرا گاندھی گٹھ جوڑ کے اس نازک مرحلے پر ہڑتال کا اعلان کر کے ایک بار پھر انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور اس منظم ہڑتال سے یہ مسئلہ از سرِ نو تازہ ہو گیا ہے۔ لیکن ہم اس سلسلے میں وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ محض ہڑتالوں سے کبھی حل نہ ہو گا اس کے لیے بڑی احتیاط، دانشمندی اور ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے۔ یہ بات ہمارے فہم سے بالاتر ہے کہ عین اس وقت جب بھارت کشمیر کو ہمیشہ کے لیے ہڑپ کرنے پر تُلا ہوا ہے ہماری حکومت اس ظالم ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات بحال کرنے میں کیوں سرگرمی دکھا رہی ہے؟ بھارت اس وقت شدید نوعیت کے غذائی اور صنعتی بحران سے دوچار ہے اور ان پر آشوب حالات میں اس کے مربی اور محسن بھی اس کی اعانت اور دستگیری کے لیے آمادہ نہیں ہو رہے۔ وہ اسے اسلحہ دینے پر تو تیار نظر آتے ہیں مگر غلّہ اور خام مال دینے میں کافی لیت و لعل سے کام لے رہے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ چونکہ یہ بحران اب بھارتی معیشت کا مقدر بن چکے ہیں اس لیے ان دائروں میں اُن کی کوئی وقتی امداد اس کی معیشت میں کوئی استحکام پیدا نہیں کر سکتی۔ اُن کے نزدیک بھارت کو معاشی اعتبار سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اُسے فوجی اعتبار سے اس قدر طاقتور بنا دیا جائے کہ وہ قوت کے زور سے غلے اور خام مال کی منڈیوں پر قبضہ کرے اور ان سے خود بھی فائدہ اُٹھائے اور اپنے محسنوں کو بھی فائدہ اُٹھانے کے بھرپور مواقع فراہم کرے۔ بنگلہ دیش کی معیشت بھارت کے ہاتھوں جس طرح تاراج ہو رہی ہے اس سے بھارت اور اس کے سرپرستوں کے عزائم کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی بصیرت اپنی جگہ مسلّم، اُن کی سیاسی سمجھ بوجھ بھی قابلِ ستائش لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ بھارت کو جس غذائی اور صنعتی بحران سے

نکالنے کے لیے اس کے جگری دوستوں تک نے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے اور اسے آس پاس کی کمزور قوموں کے قدرتی وسائل پر بالجبر قبضہ کرنے کی راہ دکھائی ہے، اس میں ہم اس کی اعانت کے لیے کیوں اتنے فکر مند نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں بھارت اور ہمارے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے سخت مجبوری کے عالم میں اور اپنے ہی خواہوں سے یکسر مایوس ہو کر محض اپنے غذائی اور صنعتی بحران پر قابو پانے کے لیے پاکستان کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کرنا گوارا کیا ہے۔ ان تعلقات نے اس کی ذہنی کیفیت کس حد تک تبدیل کی ہے، اس کا اندازہ اس زبردست احتجاج سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے ہتھیاروں کے معاملے میں امریکہ کے موقف میں معمولی سی تبدیلی پر کیا ہے درآنحالیکہ اس کے اپنے ہاں ہتھیار تیار کرنے کی اکتیس فیکٹریاں دن رات کام کر رہی ہیں اور روس اسے مسلسل بے حد و حساب اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

---

اسی سلسلہ میں ہم وزیر اعظم کی خدمت میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے حاشیہ نشینوں نے سیاسی مخاصمت کی بنا پر میاں طفیل محمد صاحب، امیر جماعت اسلامی کی جس معقول تجویز کا حلیہ بگاڑ کر اس کا استخفاف کیا ہے وہ مسئلہ کشمیر کے حل میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کشمیر کا مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اس لیے یہ بات اربابِ اختیار کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی ہے کہ چونکہ یہ تجویز حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت نے پیش کی ہے اس لیے اسے لازمی طور پر مسترد ہی کرنا چاہیے۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور بھارتی جارحیت کو سندِ جواز دینے کے لیے دنیائے اسلام کا جاہ و جلال جمع کیا جا سکتا تھا تو آخر کشمیری مسلمانوں کی مظلومیت کا مداوا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کیوں نہیں بلائی جا سکتی۔ خدا کا شکر ہے کہ عالم اسلام میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ان کے اندر اپنی قوت کا احساس بھی بڑی تیزی کے ساتھ ابھر رہا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک نے پچھلے دنوں تیل کے ہتھیار کو جس ہنرمندی اور اعتماد کے ساتھ استعمال کیا ہے اس سے بڑی بڑی قومیں بوکھلا اٹھی ہیں۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر یہ سارے مسلم ممالک مل کر بھارت کو راہ راست پر لانے کا ارادہ کر لیں تو انہیں کامیابی نصیب نہ ہو۔

---